اور وہ ان زمانوں کو نہیں جانتے تھے جب وہ سٹیج اور ٹیلی ویژن پر ثقافتی نمائندے گردانے جائیں گے..

گاؤں کی منجمد رات کے اترتے ہی نائی' دھوبی' ترکھان' لوہار' ماچھی' جولاہے... بے دم اور بے حال دن بھر کی مشقت کی بدن توڑ تھکاوٹ میں چُورا پنے دیئے کی لو نیچی کر دیتے تھے کہ ان کے پاس رات میں دیکھنے کو کچھ نہ ہوتا تھا.. اور کچے دیئے میں ڈلے کڑوے تیل کو پورا مہینہ چلانا ہوتا تھا..

کاشت کاروں اور جاٹوں کے محلّے بھی الگ ہوتے تھے اور وہ بھی سورج غروب ہوتے ہی گہری چپ میں چلے جاتے تھے.. اگرچہ وہ چودھری کہلاتے تھے لیکن ان کی مشقت سب سے بدتر تھی جو انہیں جانوروں میں بدل دیتی تھی.. منہ اندھیرے اٹھ کر ڈنگروں کے لیے چارہ کاٹنا اسے کترنا.. کھرلیوں میں ڈالنا.. پھر ڈنگروں کی کوٹھڑیوں میں بھاپ دیتے گوبر کو ہاتھوں میں سمیٹ کر کچے فرش کو دھونا.. اور اس کے بعد کنواں جوتنا.. کھیتوں میں ہل چلانا مکمل تاریکی میں.. ان کے پاس محض ایک تکبر تھا کہ وہ زمین سے خوراک اگاتے تھے.. تو وہ سرِشام بے سُدھ ہو جاتے تھے..

گاؤں کے سب محلّے سرِشام چپ میں چلے جاتے تھے اور ان کے دیئے بجھ جاتے تھے اور گلیوں میں سوائے آوارہ کتوں کے کوئی اور ذی روح حرکت نہیں کرتا تھا' لیکن صرف جولاہوں کے گھر ایسے تھے جہاں چراغ جلتے رہتے تھے اور کھڈیوں کی کھٹ کھٹا کھٹ سردیوں کی راتوں میں ورق کوبوں کی دھم دھما دھم کی مانند ایک مخصوص لَے کے ساتھ ابھرتی گاؤں سے باہر جوہڑ سے پار کھیتوں تک چلی جاتی تھی اور وہ ان میں روپوش ٹڈوں اور مینڈکوں کو بے آرام کر کے انہیں پھدکنے پر اکساتی تھی.. پنجاب کے ہر گاؤں کی مانند اس گاؤں میں بھی عموماً نائیوں اور جولاہوں کو پیدائشی طور پر بے وقوف گردانا جاتا تھا.. تم بندے ہو یا نائی ہو.. کیا جولاہوں ایسی بات کی ہے.. یہ روزمرہ کے محاورے میں شامل تھا.. اگرچہ نائی فرائڈ سے بہت پہلے انسانی نفسیات کی گتھیاں سلجھانے پر قادر ہو چکے تھے.. وہ سارا دن گاؤں کے لوگوں کی کھبل گھاس ایسی داڑھیاں اپنے کُند استروں سے مونڈھتے تھے' ان کی بغلیں صاف کرتے تھے' ناخن تراشتے تھے اور پھر اسی اُسترے سے اپنے گدھوں کے لیے جاٹوں کی اجازت سے چارا بھی کاٹتے تھے.. اپنے آگے سر جھکانے والے ہر شخص کے مزاج اور پیشے کے مطابق مسلسل گفتگو بھی کرتے تھے.. ان کے وجود کی اہمیت صرف تین موقعوں پر ظاہر ہوتی تھی.. جب شادی بیاہ پر وہ دیگیں پکاتے تھے کہ وہ ماہر باورچی بھی

ہوتے تھے.. یا ان کی گھر والی یعنی نائن کچی عمر میں بیاہ دی جانے والی بچی کے ہمراہ اس کے سسرال جاتی تھی ..اور اسی کی ڈولی میں بیٹھ کر جاتی تھی اور شب عروسی اسی کوٹھڑی میں اکثر موجود رہتی تھی جس میں دولہا دلہن موجود ہوتے تھے اور دولہا کی ناتجربہ کاری پر دھیان دیتی تھی کہ کہیں وہ بچی کو کوئی ضعف نہ پہنچا دے.. بلکہ ان دو ناپختہ ناتجربہ کاروں کو گائیڈ بھی کرتی تھی ..نائی کی حیات میں تیسرا سنہری موقع گاؤں میں کسی بھی بچے کی رسم ختنہ ہوتی تھی ..اس موقع پر وہ سب سے اہم شخصیت ہو جاتا تھا۔ اس کے سامنے چودھری ہوں یا جولاہے سب دبک کر بیٹھتے تھے کہ یہ ان کے بچے اور نسل کے تسلسل کا مسئلہ ہوتا تھا.. نائی کا استرا ذرا ترچھا پڑ جائے تو سب کچھ معدوم ہو جاتا تھا..

بچے کو دو اینٹوں پر بٹھا کر چاچا نائی اسے پچکار کر کہتا کہ پتّر اوپر دیکھو ایک چیل گدھا اٹھائے لیے جا رہی ہے اور بچہ اس حیرت کے وقوعے کو دیکھنے کے لیے اوپر دیکھتا تھا.. ذرا سا بے دھیان ہوتا تھا اور نیچے سے اس کا کام تمام ہو جاتا تھا.. یہ گاؤں کے نائی تھے..

نائیوں کے بے وقوف ہونے کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا' البتہ جولاہوں کا معاملہ ذرا الگ ہے..

جولاہے .. ہمہ وقت اپنے تانے پیٹے میں الجھے رہتے تھے .. الگ تھلگ .. گاؤں کے معاشرے سے الگ مگن رہتے تھے .. گاؤں کے دیگر لوگوں سے ان کا رابطہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے تانے پیٹے میں الجھے رہتے تھے .. وہ ایک اندھیری کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے ایک مخصوص ردھم کے ساتھ دائیں ہاتھ سے سُوت کی چرخی کو .. نال کو .. تنے ہوئے رنگ رنگ دھاگوں کے درمیان پھسلاتے اور پھر صرف ایک دھاگے کو بُنت میں شامل کرنے کے لیے بائیں ہاتھ سے ہتھی کو کھینچتے ... ایک اپنے آپ میں مگن اور تنہا زندگی کرتے تھے .. وہ اپنے آپ اور اپنی کھڈیوں میں اتنے مگن رہتے تھے کہ دیگر انسانوں سے میل نہ کر سکتے تھے .. تنہا اور گم رہتے تھے .. شاید اسی لیے دوسرے لوگوں کے ساتھ ربط نہ رکھنے کے باعث .. میل نہ کرنے کی وجہ سے ان کی دانش محدود رہتی تھی .. اتنی ہی رہتی تھی جتنی رب نے ان میں بھر دی تھی' اس میں اضافہ نہ ہوتا تھا۔ مکمل تنہائی کے باعث .. دوسرے انسانوں سے مکمل دوری ... معاشرے سے قطعی طور پر کٹے ہوئے ایک کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے .. وہ صرف اپنی ذات میں مگن رہتے تھے..

وہ اسی لیے کم عقل کہلاتے تھے کہ وہ آس پاس سے کٹے ہوئے ہوتے تھے .. چنانچہ

دوسری ذاتیں جب کسی کو بے توقیر کرنا چاہتی تھیں' اسے شرمندہ اور خجل کرنے کے درپے ہوتی تھیں تو یہی طعنہ دیا جاتا تھا کہ تم نے کیا جولاہوں ایسی بات کی ہے ....تو جولاہوں کی تنہائی اور دیگر انسانوں سے کٹ کر ایک مخصوص چال میں چلنے کی خصلت انہیں وہ سادگی اور بھولپن عطا کرتی تھی' جسے بے وقوفی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا تھا..لیکن زندگی کا یہی چلن انہیں بعض اوقات دیگر ذاتوں سے ممتاز کر دیتا تھا...وہ کھڈی پر الگ اکیلے بیٹھے کوئی کھدر یا کھیس بُنتے اُس نَے میں سر ہلانے لگتے تھے جو چل سرمت کے سر میں دھومیں مچاتی تھی..وہ انسانی معاشرے کی آلودگی سے بچ کر سوچ کی ایسی صوفیانہ راہوں پر چل نکلتے تھے' جہاں شاہ حسین اقرار کر رہے ہوتے تھے کہ..

اَنی حسین جولاہا..نہ اوہ مومن نہ اوہ کافر

جو آہا سو آہا..

اور یوں نسل انسانی جن سوالوں کے جواب تلاش کرتے کرتے دربدر ہوتی تھی' وہ انہیں بُوجھ لیتے تھے..اور بقیہ ذاتوں سے بلند ہو جاتے تھے..اس گاؤں کے جولاہوں کی ایک اور خصوصیت بھی تھی' وہ اگرچہ اپنے بنائے ہوئے کھدر کی مانند کورے ہوتے تھے..لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے لیکن موسیقی کے رسیا تھے..عارفانہ کلام کے شیدائی تھے..جب کہ دوسرے لوگوں میں یہ حِس مفقود تھی..

ان کے محلے کے درمیان میں ایک وسیع کچا ویہڑہ تھا' جس کے ایک جانب مسجد کی دیوار سے منسلک چھپروں تلے ان کی کھڈیاں تھیں' جن کے تانے پیٹے کچے صحن کے درمیان تک جاتے تھے اور وہیں جہاں تانے پیٹے ختم ہوتے تھے' وہاں گاؤں کا سب سے قدآور اور گھنا برنے کا پیڑ تھا' جس کی چھاؤں پورے صحن کو ڈھانپ لینے کے لیے کافی ہوتی تھی..

یہ حال کا مقام تھا..

برنے کا درخت برابر کی مسجد کے میناروں سے بھی قد میں نکلتا تھا..

یہیں اس کے تلے منڈلی جمتی تھی..حال پڑتا تھا' حال کھیلا جاتا تھا..لیکن صرف سردیوں کی گُھپ اندھیر ٹھٹھرتی راتوں میں..

بندوبست جولاہوں کا ہوتا تھا لیکن منڈلی میں سبھی لوگ شامل ہوتے تھے..کیا جاٹ اور کیا لوہار' ترکھان..

دو لالٹینوں کی روشنی میں..جو اس وسیع کچے ویہڑے کو جو برنے کے گھنے پن کے

باعث گاؤں کے گلی کوچوں کی نسبت قدرے زیادہ تاریک ہوتا تھا..اس کو تو کیا روشن کرتیں لیکن جولاہوں کے پورے محلے میں صرف یہی دو لالٹینیں تھیں' جو ان دو گھرانوں سے آتی تھیں' جن کے کھیسوں کے نمونے اتنے مختلف اور دل کش ہوتے تھے کہ وہ نزدیکی قصبے کی منڈی میں مناسب قیمت پا جاتے تھے۔ ورنہ کسانوں کی بیٹیوں کو جہیز میں دیئے جانے والے کھیسوں کی نقد ادائیگی نہ ہوتی تھی..فصل کٹنے پر گندم کی صورت ملتی تھی..جس کے پلّے نقد رقم ہوتی تھی' صرف وہی اپنی جمع پونجی کے ساتھ ایک لالٹین خریدنے کی استطاعت رکھتا تھا..ان دو گھروں کے علاوہ دوسرے جولاہوں کے گھروں میں وہی مٹی کے چراغ جلائے جاتے تھے' جو سرِشام جلتے تھے اور روٹی ٹکر کھانے کے فوراً بعد بجھا دیئے جاتے تھے۔

لیکن ان دو لالٹینوں کی روشنی ایسی تھی کہ وہ میرے میں قوالوں کے منتظر ہر چہرے کو.. برنے کے درخت کی گھنی شاخوں اور بلندی کو..مسجد کے میناروں کو روشنی اور سایوں سے ایسی معنویت دیتی تھی کہ ایک بھید بھری ہزار داستان وجود میں آنے لگتی تھی..ایک ایسا اسرار جنم لیتا تھا کہ جس میں سانس لینے والے..قوالوں کے منتظر چہرے کسی اور دنیا کے باشندے دکھائی دینے لگتے تھے..سبھی ایک ہی ذات کے ہو جاتے تھے..

قوالوں کی آمد سے پیشتر کچھ انتظامات کیے جاتے تھے..برنے کے درخت کی سب سے اونچی ڈال کے گلے میں ایک مضبوط رسّہ لٹکایا جاتا تھا..اسے ڈال کے ساتھ باندھ کر اتنا لٹکایا جاتا تھا کہ اس کا سرا جولاہوں کے سروں کے عین اوپر جھولتا تھا اور وہ اپنے سر پرے پرے کرتے تھے جیسے وہ رسّے کا سرا نہ ہو ایک ناگ کا پھن ہو..

سب جانتے تھے کہ اس رسّے کا کیا مصرف ہے..

اپنے اپنے کھیسوں میں لپٹے کچی زمین کی ٹھنڈک محسوس کرتے لیکن قطعی بے آرام نہ ہوتے۔ منتظر لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرتے..اور یہ سب وہی لوگ ہوتے تھے جن کی پاٹ دار آوازیں پورے گاؤں میں سنائی دیتی تھیں..لیکن یہاں وہ دھیمے ہو جاتے تھے' جیسے اونچا بولنے سے بے ادبی ہوتی ہو..

قوال کہیں دور دراز سے آتے..

پہلے موٹی تنوری روٹیوں اور گاڑھے دودھ کے کچے پیالوں سے ان کی تواضع کی جاتی.. وہ ذرا تازہ دم ہو جاتے اور اپنی پٹاریاں کھولنے لگتے جن میں طبلے اور ہارمونیم پوشیدہ ہوتے..وہ

انہیں سر ہلا ہلا کر سُر میں کرتے..اس دوران سب لوگ انہیں نہایت اشتیاق سے تکتے رہتے..
میراثیوں کا اشتیاق سب سے جدا ہوتا تھا اور وہ طبلے کی ہر تھاپ پر سر جھٹک کر کہتے ''واہ جی واہ..
سبحان اللہ میاں صاحب''..جاٹوں کی سمجھ میں یہ ہرگز نہ آتا کہ وہ سبحان اللہ کس بات پر کہہ رہے
ہیں..اور وہ ذرا رنجیدہ ہو جاتے کہ ان میراثیوں کو جو کچھ سمجھ میں آ رہا ہے وہ ہمارے پلّے کیوں نہیں
پڑ رہا..

طبلے اور ہارمونیم جب سُر میں آ جاتے تو قوال ذرا وقفہ لیتے اور اس وقفہ میں انہیں پھر
سے پھاتاں ماچھن کے تنور سے نکلی ہوئی گھنی بناوٹ کی موٹی موٹی روٹیاں اور چودھریوں کے
گھروں سے آئے ہوئے کچے دودھ کی چائیاں پیش کی جاتیں جو وہ بنا سانس لیے اپنے شکم میں
اتارتے جاتے اور سُر میں آتے جاتے..

جب تواضع کا اخیر ہو جاتا تو انہیں زردہ کھلایا جاتا..

تب وہ مکمل سُر میں آ جاتے..

گاؤں والے اس پوری رونین سے واقف تھے اس لیے نہایت صبر سے بیٹھے رہتے..

رات گہری ہونے لگتی..گاؤں کے نواح میں جتنی بھی سرسبز یاں کھیتوں کی پھیلتی تھیں ان
پر کُہرا پڑنے لگتا..کُہرے کی سفیدی رات کے گھنے پن میں بھی دکھائی دینے لگتی..لیکن اس کا اثر
برنے کے درخت تلے بیٹھے شائقین پر کچھ کم ہوتا کہ درخت کے پتے اس کُہرے کو اپنے آپ پر
وارد کر کے نیچے بیٹھے لوگوں تک نہ پہنچنے دیتے..

تب قوالی شروع ہو جاتی..

وہ پہلے تو نہایت دھیمے انداز میں گلے کو صاف کرنے کے لیے کچھ مدھم سی تانیں لگاتے
جیسے نیند سے بیدار ہو رہے ہوں..طبلے اور ہارمونیم میں خاصی دیر تک ذرا نچلے سروں میں اپنے
آپ کو درست کرتے رہتے جیسے کوئی مشق کر رہے ہوں اور پھر ضبط کے بندھنوں کو توڑ کر بے اختیار
اور بلند آہنگ ہو جاتے۔

اس بلند آہنگ اور بے اختیاری کے شروع ہوتے ہی میراثی بھی بے اختیار ہو جاتے
اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر ''واہ جی واہ'' الاپتے کھڑے ہو جاتے..صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ
یہ ہماری رات ہے..ہم ہی سمجھنے والے ہیں اور ہمیں کمتر سمجھنے والو تم نہیں سمجھ رہے اور ہم سمجھ
رہے ہیں..

جولاہے نہ بے اختیار ہوتے نہ کھڑے ہو کر داد دیتے کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا' وہ اسے اپنے اندر اتارتے ایک گہرے امن میں چلے جاتے تھے۔ سرد خاموشی میں.. برنے کے پیڑ تلے.. مسجد کے میناروں کے سائے میں وہ سر جھکائے.. جیسے اب بھی اپنی کھڈی پر بیٹھے کھیس بنتے ہوں وہ شانت ہو جاتے تھے..

سرد خاموشی میں.. قوالوں کے گلے کا زور گاؤں کے ہر کواڑ پر دستک دیتا چلا جاتا..

ان کی صدا گاؤں کے باہر جن سرسبز یوں پر کہرے کی سفید تہہ جم چکی تھی' اس کی برفیلی سفیدی کے ایک ایک ذرّے تک پہنچتی تھی۔

لیکن اب کسان ذرا بے آرامی اور تشویش میں مبتلا ہوتے تھے کہ انہوں نے تھوڑی دیر بعد ڈنگروں کو چارہ ڈالنا تھا اور ہل جوتنا تھا.. وہ نہیں جانتے تھے کہ جن بالکوں کو وہ کچی کوٹھڑیوں میں سوتا چھوڑ آئے ہیں' وہ بھی جہاں جہاں دو لالٹینوں کی روشنی اور سائے کا کھیل تھا' وہاں سائے میں روپوش بیٹھے قوالوں کو سن رہے تھے اور برنے کی ڈال سے لٹکتے رسّے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے..

کہرے کی سرد سفیدی نامعلوم انداز میں برنے کے پتوں میں سے نیچے بیٹھے لوگوں کو گرتی محسوس ہوتی تھی.. لیکن کوئی بھی لمس سے مس نہ ہوتا تھا.. سردی اتنی بڑھ جاتی کہ مسجد کے سفید مینار بھی برف لگنے لگتے..

کہیں نصف شب کے لگ بھگ نورے ماچھی یا دینے تیلی کو حال پڑ جاتا.. ابھی وہ آلتی پالتی مارے اطمینان سے بیٹھا ہوتا اور ابھی وہ منہ کے بل جا گرتا اور اوندھا ہو کر تڑپنے لگتا۔ اس مچھلی کی مانند جو جوہڑ کے کیچڑ میں پھنس جاتی ہے.. جولاہے جیسے اس وقوعے کے منتظر ہوتے.. وہ چنداں متعجب نہ ہوتے اور بڑے اطمینان سے اٹھ کر نورے ماچھی یا دینے تیلی کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھا لیتے اور پھر اس کے دونوں پاؤں رسّے سے جکڑ کر اُلٹا لٹکا دیتے.. وہ بظاہر بے خبر اور مدہوش ہوتا..

قوال مزید جوش میں آ جاتے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر جانے کس کا اور کون سا عارفانہ کلام الاپتے رہتے.. گاؤں کے لوگوں میں کوئی اکا دکا ہی پڑھا لکھا ہوتا ہوگا اور وہ بھی کہیں شہر میں ہوگا' اس لیے انہیں اس عارفانہ کلام کی زیادہ سمجھ بوجھ نہ تھی.. بس کہیں کہیں انہیں کوئی ایک آدھ مصرعہ سمجھ میں آ جاتا تو وہ اس کے نشے میں دیر تک سر ہلاتے رہتے..

نورے ماچھی یا دینے تیلی کا بھی یہی حال تھا.. جونہی کوئی ایک مصرعہ مکمل طور پر ان کی سمجھ میں آتا تو ان پر حال پڑ جاتا.. عام طور پر وہ ؎ میں ناہیں سب توں.. پر یکدم تڑپنے لگتے اور ان کے تشنج سے کھنچے ہوئے لبوں میں سے.. سب توں.. سب توں.. کی بڑبڑاہٹ جاری رہتی..

برنے سے لٹکتے رسّے میں بندھا وہ شخص مسلسل تڑپتا رہتا' جیسے کسی کُنڈی میں پھنسی مچھلی تڑپتی ہے.. کبھی وہ کسی کینچوے کی مانند اپنے بدن کو سمیٹتا اور کبھی اسے ڈھیلا چھوڑ کر بے جان سا ہو کر لٹکنے لگتا..

قوال اپنی لے تیز تر کرتے جاتے.. طبلے والے کی ناک طبلے کے اوپر جھکتی ہوئی اس پر چلتی انگلیوں کی تھرتھراہٹ سے الجھنے لگتی اور ہارمونیم پر قوالوں کے بال بکھرنے لگتے.. وہ سب کے سب اتنے مگن اور مست ہو جاتے۔

تب جولاہے اسے آہستہ آہستہ جُھلانے لگتے.. جیسے جُھولنا جھلاتے ہیں.. رسّے سے بندھا شخص اس حال سے جدا ہو کر کسی اور حال میں جا چکا ہوتا اور بڑے مزے سے جولاہوں کے دھکیلنے سے آہستہ آہستہ جھولنے لگتا.. یہ نہیں کہ وہ شانت ہو جائے.. وہ اب بھی ماہیٔ بے آب کی مانند پھڑکتا اور تڑپتا تھا.. اور دو جولاہے اپنا پورا زور لگا کر اس انسانی جُھولے کو اتنا جُھلاتے... اتنا جُھلاتے کہ وہ فاتر العقل لگنے لگتے جیسے وہ جو رسّے کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور وہ جو اسے دھکیلتے جُھولنا جھلاتے ہیں تینوں یک بدن ہوں۔

دھکیلنے جُھلانے والوں میں بھی وہی خود فراموشی عود کر آتی جو رسّے کے ساتھ بندھے شخص کو مدہوش اور ماورا کرتی تھی.. اور پھر ایسا بھی ہوتا جو کسی بھی تنومند اور بھرے بدن کی گُجری کے بس میں بھی نہ ہوتا.. اونچی اور لمبی ٹالیوں میں جھلارے لیتی گُجری کی پینگ کبھی بھی ان بلندیوں کو نہ چھو سکتی تھی جس بلندی پر حال میں آیا ہوا شخص پہنچ جاتا.. وہ اس ڈال سے بھی اوپر نکل جاتا جس کے ساتھ رسّہ باندھا ہوتا تھا اور اگر وہ اس لمحے ذی ہوش ہوتا تو یقیناً آسمان سے گرتے سفید کُہرے کو اپنے چہرے پر گرتے محسوس کر لیتا..

جب کبھی وہ برنے کی شاخوں سے اوپر نکل کر پتّوں کو جا چھوتا تو لمحہ بھر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور نیچے بیٹھے لوگ دم روکے منتظر ہوتے اور تشویش میں مبتلا ہوتے کہ کہیں وہ اُدھر ہی نہ رہ جائے.. کیا پتہ واپس نہ آئے اور پھر اُسی لمحے اس کا پھڑکتا وجود نیچے آتا اور دونوں جولاہے اسے پھر سے دو چار قدم بھاگتے دھکیل دیتے۔

پھر وہ لمحہ آتا جب اسے دھکیلنے کی ضرورت باقی نہ رہتی..

جولاہے آگے ہوتے اسے زور لگا کر جھلانے کے لیے اور وہ اپنی ٹانگیں سمیٹتا ایک اضطرابی اور سیمابی کیفیت میں خود ہی زور لگانے لگتا اور اس میں بہترین نسل کے دس بیلوں کا زور جانے کہاں سے آجاتا..اور وہ مدہوش بدمست جولاہوں کے دھکیلنے سے بے نیاز ہو جاتا..

دونوں جولاہے پیچھے ہو کر وہیں جا بیٹھتے جہاں سے وہ اٹھے تھے..وہ جان جاتے تھے کہ اسے اب ان کی مدد کی ضرورت نہیں رہی..

رسّے کے ساتھ الٹا بندھا نُورا یا دینا ٹانگیں سمیٹتا بے خود حالت میں..اتنے زور میں جو شاید دس نسلی بیلوں میں بھی نہ ہوتا تھا..اپنے زور سے برنے کی بلند ترین شاخوں تک جاتا تھا..

وہ جو ایک بالک تھا..اپنے کسان باپ کے سامنے جھوٹ موٹ سو گیا تھا' اب چوری چھپے سائے میں بیٹھا سردی میں ٹھٹھرتا اس حیرت ناک عمل کو منہ کھولے دیکھ رہا تھا..

سب کی توجہ کا مرکز نُورا یا دینا تھا..کوئی بھی قوالوں کو نہیں سن رہا تھا..اور قوال بھی اس بے توجہی سے واقف تھے اور ان کی نظریں بس برنے کے رسّے سے الٹے بندھے ٹانگیں سمیٹتے پھڑ پھڑاتے شخص پر تھیں اور وہ بھی حیرت میں تھے کہ ہم نے کیا الاپ دیا ہے جو اس ان پڑھ شخص پر یہ اثر ہوا ہے کہ اس میں دس بیلوں کا زور آ گیا ہے اور وہ اس زور کے بل بوتے پر تن تنہا زور لگاتا برنے کی بلند ترین شاخوں میں جا روپوش ہوتا ہے۔

وہ جو منہ کھولے چوری چھپے سائے میں اپنے آپ کو روپوش کرتا اس حیرت ناک عمل کو منہ کھولے دیکھ رہا تھا...وہ تب..ایک بالک کے طور پر..اُن گئے گزرے زمانوں میں یہ قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ کسی ذی ہوش کے لیے..کسی بھی عام شخص کے لیے ایسا ہو جانا بھی ممکن ہے کہ وہ نورے اور دینے کی مانند پھڑکتا تڑپتا لگے..ایسے کہ دو جولاہے اسے ایک جھولے کی مانند جھلانے لگیں اور وہ بے خبر رہے..تڑپتا پھڑکتا رہے اور پھر ایک ایسا وقت بھی آ جائے کہ بے خودی کے بے عقل اور بے شعور زور میں وہ اس عالم مستی میں ایسا خود کفیل ہو کہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت باقی نہ رہے اور وہ جذب کی ایسی کیفیت میں چلا جائے کہ خود ہی اپنے بدن کی بے اختیاری کا جھولنا جھلاتے برنے کی بلند ترین شاخوں سے بھی آگے نکل کر آسمان کو اپنی نظر سے دیکھنے لگے..

وہ یہ قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا..نہ..

....کہ ایسے زمانے بھی آنے کو ہیں جب ایک شکل کی گرفت میں آ کر وہ بھی ایک ایسے

ہی رسّے سے بندھا ہوگا اور حال کھیلتا ہوگا.. بے خود اور بے پروا ہوگا..

اس کے گمان میں بھی نہ تھا..

گئی رات.. جب قوالوں کے گلے بیٹھ جاتے.. سردی برداشت سے باہر ہو جاتی' حال کھیلنے والے شخص کا بدن ڈھیلا پڑ کر رسّے سے لٹکنے لگتا تو وہی دونوں جولاہے اٹھ کر اس کے پاؤں سے بندھے رسّے کو کھول دیتے تھے اور وہ جولاہوں کے ویہڑے کے کچے اور سرد فرش پر ایک لاش کی مانند دھپ سے بے جان گر جاتا تھا اور اگلی سویر تک وہیں بے سُدھ پڑا رہتا تھا۔

سویر ہوتی.. برنے کی شاخوں میں سے دھوپ کے زرد ذرّے اس کے بے سُدھ بدن پر اترتے تو وہ یوں اطمینان سے اٹھ بیٹھتا جیسے وہ ہر سویرا اٹھتا تھا.. کسی بھی یادداشت کے بغیر.. وہ اگر قدرے فکرمند ہوتا تو صرف اس لیے کہ آج میرے بدن میں یہ اکڑاؤ ہے' نسیں اور پٹھے تنے ہوئے اور تھکے کیوں ہوں.. پھر وہ ایک کمی کمین کی مانند جسے سوچنے کا اختیار نہیں تھا' چپ چاپ اٹھ کر اپنے کام کاج کی جانب چلا جاتا۔ نہ کوئی اس سے دریافت کرتا کہ پچھلی رات تم پر کیا بیتی.. اور اگر کوئی پوچھتا بھی تو وہ نہیں جانتا تھا کہ اس پر کیا بیتی تھی.. پچھلی شب اس پر کیا گزری تھی... جو گزری سو گزری ہم پر شب ہجراں..

بس یہی حال تھا جو اسے پڑ گیا.. ایک دیا سلائی کے جلتے ہی..

اندھیری سیڑھیوں میں ایک شکل کے مڑ کر دیکھنے سے..

لیکن بہت زمانوں کے بعد..

جانے تو نے اسے کس حال میں دیکھا..

بس اسی حال کا بیان تھا۔

تو محمد علی ڈاکیا اس کے لیے ایک خط لے کر آتا ہے جو حال میں ہو.. جس پر حال پڑتا ہو..

وہ بے شک برنے کی بلند ترین شاخوں تک جھول جاتا ہو لیکن یہ ڈاکیا اس تک وہ خط پہنچا دیتا ہے۔

یہ طے نہیں کہ اس جھولے میں کون جھولتا ہے.. کوئی سوہنی یا نتالیہ..

وہ سب ایک ہیں۔

ڈاکیا یہاں بھی پہنچ گیا تھا..

ایک خط کے ساتھ..

اسے کھول کر دیکھنا ہے کہ یہ کس نے تحریر کیا ہے' کس کے نام لکھا ہے.. برنے کی بلند ترین شاخوں کو ایک شاہ گوری کی ناک بھی چھوتی تھی.. کیا یہ خط اس نے لکھا ہے؟

اندھیری سیڑھیوں میں باون سیڑھیوں میں سے کسی ایک سیڑھی کے اوپر جو تاریک خلا ہے' اس میں یکدم دیا سلائی بھڑکنے کے ..فوراً بعد چمڑے کی بیلٹ اور شکاری کی بندوق نہیں آ جاتی..ان کے درمیان کچھ اور پڑاؤ بھی ہیں جن کے نتیجے میں بقیہ اکیاون دیا سلائیاں بھی بھڑک اٹھی تھیں۔

حافظا برخوردار نے عشق کے جس ہاتھی کو بیان کیا ہے' وہ یکدم تو مست نہیں ہو جاتا.. ایک دیا سلائی کے بھڑکنے سے تو وہ محض ٹھٹکتا ہے کہ یہ کیا ہوا ہے اور پھر دھیرے دھیرے وہ اپنے وجود سے اپنی ذات سے بے پرواہونے لگتا ہے.. پاگل ہوتا ہے اور پھر یوں بے قابو ہو جاتا ہے کہ ہر سُو شور مچ جاتا ہے کہ..

پوش پوش...ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔

ان کے درمیان کچھ اور پڑاؤ بھی ہیں۔

سرما کے کُہرے کی ماری ہوئی خشک گھاس سرسراتی ہوئی ایک میدان کی صورت محض پس منظر کا کام دیتی ہے۔ایک عشق سے دمکتے دنیا سے ڈرے ہوئے چہرے کے لیے..گھاس اتنی خشک ہے کہ لاپروائی سے پھینکے جانے والے ایک سگریٹ کے لمس سے ہی سلگ اٹھتی ہے اور سلگاہٹ آگ میں بدل کر یوں پھیلتی ہے کہ ہر جانب دھواں ہی دھواں اٹھتا ہے مگر وہ دمکتا چہرہ صاف دکھائی دیتا رہتا ہے..

کبھی وہ اپنے ساتھ بارش لے آتی ہے..صحن کی بیلوں پر جو بوندیں تیرتی ہیں گویا اس کے رخساروں پر پڑتی ہیں اور وہ انہیں پونچھتی ہوئی اپنے زرد پیراہن میں اپنی سانسیں درست کرتی ہے..زرد پیراہن پر جہاں جہاں بارش کی بوندیں پڑ رہی ہیں' وہاں وہاں ایک سُنہرا پن ہے جو اس

کے بدن کا ہے..

چمڑے کی بیلٹ اور شکاری کی بندوق تب آتی ہے' جب صحن اور جنسی کشش بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور آگے ایک آگ کا دریا ہے جس کے پار ڈوب کے جانا ہے..

ایک ایسا صحرا ہے جس کے غزال ہی جانتے ہیں کہ دیوانے پہ کیا گزری اور جن اونٹوں والوں نے اسے پار لے کر جانا تھا' وہ کب کے کوچ کر چکے تھے ..ایک کچا گھڑا ہے جس نے ہر صورت چناب کے پانیوں میں گھل جانا ہے اور اسے پار نہیں لے جانا..اور اس کے باوجود یہ آگ مزید بھڑکتی ہے زرتشت کی مقدس آگ اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے اور کسی چمڑے کی بیلٹ یا شکاری کی بندوق سے نہیں بجھتی..

انسان اگرچہ ایک جانور ہے لیکن اسے سچ مچ کا جانور بنتے دیر نہیں لگتی..انسانی رشتوں کی بے حسی اسے بالآخر ایسا بنا دیتی ہے..وہ بھونکتا نہیں لیکن ایک سگ کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے..وہ کلبلاتا نہیں لیکن گندی نالی میں رینگتے کیڑے کی مانند ہوا جاتا ہے..اسے تھوڑی سی الفت اور توجہ سے ایک شاہی سنگھاسن پر بٹھایا جا سکتا تھا' لیکن بے حسی اور بے مہر بے توجہی سے وہ ایک دھتکارا ہوا کتا...گندی نالی میں رینگنے والا کیڑا ہو جاتا ہے..اگر وہ طیش میں آ جائے تو قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اگر اس میں بزدلی ہے تو اپنے آپ کو مار دینے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے..لیکن مکمل سنجیدگی سے نہیں کہ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ محض اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہے..معاشرے کو سندیسہ دینا چاہتا ہے کہ میں ناخوش ہوں کچھ توجہ تھوڑی سی مسرت کا طلب گار ہوں وہ کہیں سے بھی مل جائے کیونکہ مجھے ایک کتے ایک کیڑے کی زندگی اچھی نہیں لگتی..

لیکن شاید ایسا ہے کہ وہ ایک برا اداکار تھا' اس کا چہرہ اس کی ناخوشی کا اظہار کرنے سے قاصر تھا' اس لیے معاشرے تک اس کا سندیسہ پہنچتا نہیں تھا بلکہ اسے ایک تماشا سمجھ کر پھبتیاں کسی جاتی تھی اور تب وہ سچ مچ اپنے آپ کو سانسوں کی ردھم سے آزاد کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگتا تھا تو انہی بے بس اور بے چارگی کے دنوں میں اندھیری سیڑھیوں میں ایک دیا سلائی بھڑک کر اور اس کی روشنی میں مڑنے والا چہرہ اس سے کلام کرتا ہے..کوہ طور کی آگ کی روشنی اور آہورہ مزدہ کے احکامات کے تابع جلتی ہوئی آگ کی روشنی..اس دیا سلائی کی روشنی کے سامنے مدھم پڑ جاتی ہیں اور چہرہ کلام کرتا ہے کہ..تم جانور نہیں انسان ہو..اور میں رب ہوں جو انسان بنانے پر قادر ہے..میں ہوں تو تم ہو!

پھر ایسا کیا ہوا کہ مردہ شاعرہ کا شعر ایک اختتامی کاغذ پر منتقل ہوا جو کہ آخری خط کہلایا۔
یقیناً بزدلی بے بسی اور اس بندوق کے سامنے کچی کونپل کی مانند ڈر سے تھرتھراتی لڑکی کی فنا کا خوف..جس کا وجود اسے انسان بنائے رکھنے پر قادر تھا..اگر وہ وجود ہی نہ رہے..ہلاک کر دیا جائے تو وہ ارتقاء کی تمام تر سیڑھیوں سے گرتا ہوا پھر وہیں جا گرتا تھا جہاں ایک گندی نالی تھی' اور وہ پھر سے ایک کیڑے میں بدل سکتا تھا..یہ محض اس وجود کی فنا کا ڈر تھا..جس صحن کی بیلیں دیوار سے اکھڑ کر لٹک گئی تھیں' سرخ اینٹوں کے فرش پر ادھ موئی ہو کر گر گئی تھیں' اس صحن میں رہنے والوں کے ..اس وجود کے عزیزوں کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ وہ نہیں ہوگا جو وہ چاہتی ہے اور اگر وہ ڈھیٹ بنی رہتی ہے تو اس کی زندگی کی ڈوری کو کاٹ دیا جائے تا کہ وہ خلاؤں میں کھو جائے۔اس تک یہی اطلاع پہنچائی گئی..یہ دھمکی بھی ہو سکتی تھی اسے بلیک میل کرنے کے لیے..بیک آؤٹ کروانے کے لیے..لیکن یہ حقیقت بھی ہو سکتی تھی اور اس کا امکان زیادہ تھا..بس یہی بزدلی اور بے بسی تھی جس کے باعث ..اس کے وجود کے سانسوں کی تاریں بے حسی اور خاندانی وقار کی قینچی سے کھٹ کھٹ کُترے جانے کے امکان کے خوف سے وہ بیک آؤٹ کر گیا..تا کہ وہ زندہ رہ سکے..
اور اس کے ردعمل میں اس کی جانب سے مردہ شاعرہ کا وہ شعر اس تک پہنچا..ایک زہر بجھے تیر کی مانند..اسے مجرم گردانتا..اس پر لعنت بھیجتا..ایک شعر..

یہیں سے اس کی کوہ نوردی کا آغاز ہوا تھا..کہ وہ اس شعر کے زہر سے اپنے مجرم ہونے کے احساس سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا..دشت نوردی اس نے اس لیے اختیار نہ کی کہ آس پاس اتنا بڑا دشت نہ تھا جس میں ایسا بڑا زہر اور جرم دفن کیا جا سکتا...شہروں اور بستیوں میں انسان کے مخصوص پتے ہوتے ہیں۔مکان نمبر اور گلی نمبر ہوتے ہیں جب کہ کہیں بلند پہاڑوں میں کچھ بھی نہیں ہوتا' سوائے پتھروں اور برف کے..کوئی پتہ نہیں ہوتا...اگر ہوتا تو وہاں کے ہر پتھر..ہر بوٹے اور برف کے ہر ذرے کے نام ڈھیروں خط پوسٹ کر دیئے جاتے..اور وہ سب کے سب ظاہر ہو جاتے..ان کی بے بسی اور جرم بھی عیاں ہو جاتے..وہ معصوم تھے' صرف اس لیے کہ ان کا کوئی مستقل پتہ نہ تھا..
وہ کوہ نورد ہوا تو انہی پتھروں' بوٹوں اور ندیوں کا ایک حصہ بن کر بے نام اور بے پتہ

ہوا..مردہ شاعرہ کے شعر سے فرار ہو گیا..گمنام ہو گیا تا کہ اسے کوئی بھی خط نہ لکھے..کوئی نہ پہچانے اور دشنام نہ دے کہ تم ہی بزدل تھے..لیکن یہاں بھی..کہیں بلند پہاڑوں میں وہ پکڑا گیا..پہچان لیا گیا کہ یہ وہی ہے..

اسی لیے وادیٔ شگر سے پرے..سورجوں سے حاملہ پیڑ سے کہیں آگے..ایک ندی کے جھاگ اڑاتے تند پانیوں کے پار وہ چلا آتا تھا..

اپنے بدخشانی گھوڑے کی پُشت سہلاتے..تھپکتا..چلا آتا تھا..اس کو نظر میں رکھتا جو فرار ہو کر ان پہاڑوں میں روپوش ہو جانا چاہتا تھا' اسے نظر میں رکھتا چلا آتا تھا کہ محمد علی ڈاکیے کے چرمی تھیلے میں شاید اور کچھ بھی نہ تھا صرف ایک خط تھا۔

ڈاکیا صرف ایک خط پہنچانے کے لیے اس کی جانب چلا آتا تھا..

اور اگر اس کے نام کا کوئی خط تھا تو پھر اسی کا ہو سکتا تھا...

اتنے طویل برسوں کے بعد..اسی کا ہو سکتا تھا..

اگر اس کا نہیں تو پھر کس کا ہو سکتا تھا..

کسی کا بھی نہیں!

صرف اس کا جس کے صحن کی بیلیں دیوار سے اکھڑ گئی تھیں..

بزدلی' نامردی سے بڑھ کر شرمناک ہوتی ہے..ایک مرد کے لیے!

اور یہ بزدل..بکری کا دل حیرت انگیز طور پر اس کے..جو دیا سلائی کے بھڑکنے سے پلٹی تھی' اس کے بدن میں نہیں تھا..جس نے دیا سلائی بھڑکائی تھی' اس کے اندر تھا..

بے شک لاکھ جواز ہوں کہ وہ اس کی جان کے ڈر سے پیچھے ہٹا تھا' لیکن پھر بھی یہ بزدلی تھی' جو نامردی سے بڑھ کر شرمناک ہوتی ہے..مرد اوّل تو عشق کے ہاتھی تلے مکمل طور پر روندا نہیں جاتا اور اگر ایسا ہو جائے تو بھی اپنے حواس میں رہتا ہے اور جواز تلاش کرتا ہے جو اس لمحے جب وہ پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کرتا ہے اگرچہ مکمل سچائی کے سوا کچھ نہیں ہوتے لیکن وقت کے گزرنے سے جو شدید اندوہ لپیٹ میں لے لیتا ہے جو پچھتاوا جنم لیتا ہے وہ اسے مطعون کرتا رہتا ہے کہ یہ محض بزدلی تھی' اگر جان جانے کا خدشہ تھا تو ملاپ کا بھی بے شک موہوم سہی امکان تو تھا اور تو نے اس امکان کو گنوا دیا..اسے چنداں ملال نہ ہوتا اگر وہ تمہارے لیے جان سے چلی جاتی..مگر اب عمر بھر کا ملال ہے..رنجیدگی اور شکایت ہے..

سڑک پار کرنے کے لیے زیبرا کراسنگ کی سفید دھاریاں تھیں..

جو اُن کے قدموں تلے آئیں اور ابھی دیا سلائی کے بھڑکنے کے بعد چند روز ہی گزرے تھے..

انہوں نے ایک دوسرے کو چھوا تک نہیں تھا۔

اگر ایک بندوق کلام کر سکتی ہے..چمڑے کی ایک بیلٹ بول سکتی ہے تو وہ سفید دھاریاں بھی زبان رکھ سکتی تھیں' جن پر سڑک عبور کرتے ہوئے وہ شانہ بشانہ چلے تھے تو ان دھاریوں میں سے ایک نے تو ضرور دیکھا ہو گا کہ ان دونوں کے ہاتھ شعوری طور پر یا اتفاقاً ایک دوسرے

سے چھوتے ہوئے آپس میں جڑ گئے تھے اور یہ قضیہ بہت دیر تک چلا کہ پہل کس نے کی تھی..
دونوں میں سے کوئی ایک بھی ماننے کو تیار نہ تھا کہ یہ اس کا ہاتھ تھا' جس نے دوسرے کے ہاتھ کی خواہش کی تھی..

زیبرا کراسنگ کی وہ ایک دھاری گواہی دے سکتی تھی لیکن وہ تو کب کی ٹائروں اور جوتوں کی رگڑ کی زد میں آ آ کر معدوم ہو چکی تھی اور اس پر تازہ پینٹ متعدد بار ہو چکا تھا' جس کے نیچے وہ دفن ہو چکی تھی اور دفن ہو چکی' بے شک ایک دھاری ہو وہ گواہی نہیں دے سکتی..

ویسے اور بہت کچھ بول سکتا تھا..

وہ رکشا بھی بول سکتا تھا جس کا دروازہ کھٹ سے بند ہوا.. وہ تو اسے کھلا رکھنا چاہتی تھی اسے ایک نظر دیکھنے کی خاطر لیکن اس کے سپرنگ اس کے بس میں نہ تھے اور وہ کھٹ سے بند ہو گیا.. بند ہوا تو اس کی سفید شال کا ایک حصہ باہر رہ گیا اور جب وہ رکشا دور ہوتا گیا تو بھری پُری ٹریفک کے ہجوم اور شور میں سفید شال کا وہ حصہ جدائی کے ایک پرچم کی مانند دور تک پھڑ پھڑاتا دکھائی دیا..

زیبرا کراسنگ کی وہ سفید دھاری نہ سہی اُس مکان کی کوئی نہ کوئی اینٹ تو موجود تھی جو گواہی دے سکتی تھی کہ اس نے اپنے ڈھکے ہوئے سر کو مزید ڈھک کر اس استفسار پر کہ یہ ممکنات میں سے ہے کہ ''دو بول'' پڑھ لیے جائیں.. اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا..

وہ جس آہنی کرسی پر آ بیٹھی تھی.. پہلی بار اپنا مکھ دکھلاتی تھی اس کی سخت نشست اس کی پیٹھ کے بھار سے آہنی ہونے کے باوجود دب گئی تھی.. اس کی پشت اس پر ایسے ثبت ہو گئی تھی جیسے گوردوارہ پنجہ صاحب کے ایک پتھر پر گورو نانک کا ہاتھ..

جان چلی جانے.. اس کی جان جانے کے ڈر سے جب وہ پسپا ہوا تو اس کے بعد جواب میں مردہ شاعرہ کا شعر آیا..

اور اس کے بعد..

شہر کی ایک پر ہجوم شاہراہ کے فٹ پاتھ پر.. کئی ماہ کے بعد.. وہ اچانک اُسے نظر آ گئی..

اس کی چال اب بھی شاہانہ اور زرد شہزادیوں کی طرح بلند اور پروقار تھی لیکن یہ ایک مصری ممی کی مانند مردہ اور بے روح تھی.. وہ اپنے لواحقین کی جلو میں اپنی شادی کے لیے مناسب لباس کے انتخاب کرنے کے لیے نکلی تھی... وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے بدن کے گرد سفید سوتی پٹیاں

ہیں جنہوں نے اسے حنوط کر رکھا ہے اور یہ پٹیاں اس کی پسپائی کے سُوت سے بُنی ہوئی تھیں..

وہ ایسا جولاہا تھا جو اس کے لیے شادی کا لباس تیار نہ کر سکا اور اپنی بزدلی کی کھڈی پر اسے ہمیشہ کے لیے حنوط کرنے کے لیے یہ سوتی پٹیاں بُنتا رہا..

اسے یقین تھا کہ اس نے شاید ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی تھی..اس کی آنکھوں میں کچھ شرارے اسے پہچان کر بھڑکے تھے اور پھر اس نے کچھ ضبط کیا..اس کی..بقول اس کے..پسپائی کو یاد کیا..بزدلی اور نامردی کو یاد کیا اور پھر ایک اجنبی کی مانند چلتی گئی..

اس اچٹتی ہوئی نظر میں بزدلی کے طعنے کا وہ تیر تھا جو نامردی سے بڑھ کر شرمناک ہوتا ہے..اور یہ تیر اس کے بدن میں ایسے پیوست ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ تھا وہ باہر آنے کے لیے بے اختیار ہوا اور وہ ایک مرتے ہوئے شخص کی مانند منہ کھول کر غاں غاں کرتا دوہرا ہوا اور فٹ پاتھ پر قے کرنے لگا..

آیندہ زمانوں میں .. برسوں بعد..بیس پچیس برسوں بعد بھی وہ جب کبھی ادھر سے گزرا..سفید بالوں اور جھریوں سے بھرے چہرے کے ساتھ تو بھی فٹ پاتھ کے اس حصے سے نظر چرا کر گزرا..جہاں اب تک نشان باقی تھے..اس کی قے اور بزدلی کے نشان باقی تھے...

تو وہ خط کس کا ہو سکتا تھا..

اگر وہ محض ایک ڈاکیا ہی تھا..

کوئی اور نہ تھا..

کچھ اور نہ تھا..

وہ خط کس کا ہو سکتا تھا؟

شاید مردہ شاعر کا..

اب یہ سوال میں نہیں ''وہ'' پوچھ رہا ہے کہ میں نے اسے یعنی اپنے آپ کو اپنے ہی مقابل کھڑا کر لیا ہے تا کہ ''وہ'' مجھ سے سوال پوچھے اور میں جواب دینے کی سعی کروں کہ میں اپنے آپ سے کب تک باتیں کر سکتا ہوں' اس لیے ''وہ'' میری مجبوری ہے.. چنانچہ میں فرض کر لیتا ہوں کہ یہ خط اس کے نام کا تھا لیکن اسے وصول میں نے کیا تھا۔

تو بس وہی یہ پوچھ رہا ہے کہ یہ خط کس کا ہو سکتا تھا؟

بھئی یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ تم ساری حیات اس خط کی خواہش میں ہی سرگرداں رہے.. در بدر ہوتے بھٹکتے رہے.. اس کی تلاش میں نکلے.. تم نے آوارگی کا بہانہ کیا' آشفتہ سری کو ڈھال کیا.. صحرا نوردی میں پناہ لی.. پتھروں سے کلام کیا.. تا کہ تمہارا بھید ظاہر نہ ہو جائے.. اور بھید یہی تھا کہ تم اس خط کے منتظر تھے جو کہیں نہ کہیں آ جانا تھا.. اندلس میں.. ارض روم میں.. بلیک فارسٹ میں.. جھیل جنیوا کے کناروں پر یا شاہ گوری کی برفیلی قربت میں کہیں بھی آ جانا تھا.. پتھروں سے بھی تم نے یہی پوچھا کہ میرے نام کا کوئی خط ہے..

اور خط تھے..

لیکن تمہارے نام کے نہیں تھے..

بہت بار ایسا ہوا کہ کوئی خط ملا جو تمہارا نہیں تھا لیکن تم نے وصول کر لیا..اور وہ کسی اور کے نام کا تھا..تم اس ''کسی اور'' کو بھی جانتے تھے' اس لیے تم نے اسے کھولا نہیں بلکہ ری ڈائریکٹ کر دیا..

پھر کوئی ایک خط ایسا بھی تھا..تم جانتے تھے..یقین رکھتے تھے لیکن ثابت نہیں کر سکتے تھے..جو لکھا تو گیا تھا آبِ حیات کے پانیوں سے..ان مِٹ..نصیب کے پُورنوں کے ساتھ لیکن وہ پوسٹ نہ ہوا..اسی لیے تم تک نہ پہنچا..اور یہ یقین کہاں سے آیا کہ خط تمہارے نام کسی نہ کسی نے کہیں نہ کہیں لکھا لیکن کوئی نہ کوئی مجبوری تھی ایسی کہ وہ پوسٹ نہ کیا جا سکا..کسی نے خبر کی؟ سرگوشی کی تمہارے کان میں؟ کسی وہم میں آیا..کسی خیال میں کوئی دستک ہوئی اور تم جان گئے کہ ایک خط لکھا جا چکا ہے۔ایک تحریر کورے کاغذ پر منتقل ہو چکی جو تمہارے لیے ہے..اور اسے پوسٹ نہ کیا جا سکا..

دنیا کے ہر حصے میں تم اس خط کے منتظر رہے جو نہ آنا تھا نہ آیا کہ اسے پوسٹ ہی نہیں کیا گیا تھا..

لیکن ایک خط تو بہر طور پوسٹ ہو چکا تھا..آبِ حیات سے نصیب کے پُورنوں کا ان مِٹ خط..جس کے لیے تم سرگرداں تھے..

ایک عام خط تو دو چار دن میں مل جاتا ہے..تو اس ایک خط نے وادیٔ شگر سے پرے بدخشانی گھوڑے پر سوار ڈاکیے کے چرمی تھیلے میں پہنچنے کے لیے اتنے ڈھیر سارے برس کیوں لگا دیئے..جب کہ تمہارے سر کے علاوہ بدن کے دیگر حصوں کے بال بھی سفید اور مرجھا چکے تھے..تمہارا ماس ڈھلک گیا تھا..دانت جھڑ رہے تھے اور بینائی میں فرق آ رہا تھا تو اتنی دیر کیوں ہو گئی..یہ ''وہ'' پوچھ رہا تھا..میں نہیں!

میرا گمان ہے کہ یہ خط لکھا تو گیا لیکن پوسٹ بہت بعد میں ہوا..

ہر شخص کی زندگی میں ایک خط ہوتا ہے!

کسی کو وہ مل جاتا ہے..

اور کسی کو نہیں ملتا..

جس کو وہ مل جاتا ہے وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا..کرتھیا تھیا ناچنے لگتا ہے۔انا الحق

کے نعرے لگاتا دار کی جانب چلنے لگتا ہے..کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو بھٹکتا ایک اندھے کنویں میں دفن ہو جاتا ہے۔عشق کے ہاتھی تلے بخوشی روندا جاتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے..اور جس کو یہ خط نہیں ملتا وہ شکوک اور تذبذب کی دلدل میں حیات گزار دیتا ہے اور نہیں جانتا کہ اسے وہ خط لکھا بھی گیا ہے یا نہیں.. اگر لکھا گیا ہے تو ابھی تک آیا کیوں نہیں..

تو ہر شخص.. ہر ذی روح.. ہر شہر گل بوٹے.. یہاں تک کہ ہر پتھر کے نام بھی ایک خط ہوتا ہے..جو کبھی مل جاتا ہے..اور کبھی نہیں ملتا..

وہ اس خط کے لیے بھٹکتا رہتا ہے..

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ خط اس کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے..وہ چاہتا ہے کہ اسے وصول کیا جائے اور جس کے نام وہ ہوتا ہے وہ ملتا نہیں..

بھٹکے ہوئے خط اور روحیں بہت خطرناک ہوتے ہیں۔

اور کبھی کبھار وہ آپس میں گٹھ جوڑ بھی کر لیتے ہیں..

خط کو وصول کرنے والا نہیں ملتا اور روح کو بدن نہیں ملتا۔

وہ دونوں..بے اثر..رائیگاں اور مایوس ہو کر..آپس میں گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں اور یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اب اگر کوئی وصول کرنے والا سامنے آ جائے تو ہم نے وصول نہیں ہونا اور اگر کوئی بدن آ جائے تو ہم نے اس میں حلول نہیں کرنا..

تب ''وہ'' بولا...

وہ تنگ آ چکا تھا ''تم بھی تو خطوں اور روحوں کی مانند بھٹک رہے ہو۔تم صرف یہ بتاؤ کہ ایک ایسا خط جس پر ہمارا نام درج ہو..اگر آتا ہے تو کس کا ہو سکتا ہے؟

''میں نہیں جانتا اسی لیے تو بھٹک رہا ہوں۔''

''کچھ قیاس کرو..مہمیز دو اپنے تخیل کو..''

''یہ مسئلہ یوں حل ہونے کا نہیں..اسے حل کرنے کے لیے بھی تھوڑا بھٹکنا پڑے گا.. بہت سے زنگ آلود قفل توڑنے ہوں گے..بند دروازوں پر دستک دینی ہوگی..کائی زدہ پتھروں کو اٹھا کر ان کے نیچے جو روئیدگی ہوتی ہے اس پر جھکنا ہوگا..بہت سے اندھے کنوؤں میں جھانکنا ہوگا..دھوپ میں آئے ہوئے بدنوں پر جو سنہری روئیں چھب دکھاتی ہیں ان میں سے ہر ایک کو قریب سے دیکھنا ہوگا۔''